مسئلہ تملیک فی الزکوٰۃ

از

جناب مرزا محمد یوسف صاحب

(استاذ عربی گورنمنٹ مدرسہ عالیہ اورینٹیل کالج رام پور)

زکوٰۃ بغیر تملیک مستحق علیہ کے ادا نہیں ہوتی۔

یہی منشائے کتاب اللہ ہے، یہی سنت رسول و سنت خلفائے راشدین ہے اور یہی ۱۳۷۳ سال سے امت اسلامیہ کا معمول بہ ہے[1]۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے[2] اس مسئلہ کو مبعوث عنہا بنا دیا گیا ہے کیوں کہ شرطِ تملیک کی وجہ سے زکوٰۃ کی رقم بعض ایسی مدات میں صرف نہیں کی جا سکتی جن میں صرف کرنے لو ہماری طبیعت چاہتی ہے مثلاً اس کے ذریعے سے کوئی اجتماعی نوعیت کا کام نہیں کیا جا سکتا اور غریبوں کی مجموعی بہبود کی اسکیمیں اس سے بروئے کار نہیں لائی جا سکتیں"[3] مثال کے طور پر "زکوٰۃ کی رقم سے مسجد نہیں بنا سکتے، تعلیم دین کا ادارہ نہیں کھول سکتے، اسلامی لائبریری نہیں قائم کر سکتے، شفاخانہ، کنواں، سرائے یا تالاب نہیں بنا سکتے"[4] اس تشدد کے نتیجے میں یہ شبہ پیدا ہونا فطری ہے کہ اسلام کا نظمِ معاشرت قرونِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ سماج کے لئے تو موزوں تھا مگر عہدِ حاضر کے جمہوری نظام کے لئے موزوں نہیں ہے اور اگر اسے موزوں بنانا ہے تو اسلامی شریعت کے ساڑھے تیرہ سو سال کے مستحکم قوانین میں ردوبدل کرنا ہوگا کیوں کہ آج جب کہ وسائلِ دولت آفرینی میں سائنس کی ایجادات

---

[1] اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ زکوٰۃ ۲ھ میں فرض ہوئی تھی [2] چنانچہ جماعت اسلامی کے سابق امیر مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے "ترجمان القرآن" میں دو مضمون "مسئلہ تملیک اور زکوٰۃ سے متعلق بعض دوسرے مسائل" کے عنوان سے لکھے ہیں جس میں خصوصیت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک کی شرط فقہاء کی اختراع ہے جس کے لئے کوئی نصِ شرعی موجود نہیں ہے تفصیل کے لئے دیکھئے ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ و محرم ۱۳۷۵ھ [3] ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ صفحہ ۳۹۹ [4] ایضاً صفحہ ۳۹۸ بحذف و اختصار

والکشافات سے بے حد اضافہ ہوگیا ہے اور اسی تناسب سے مملکتی مصارف اور مملکت کی مالی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں اگر ملا یا بوریا نشین نے ساڑھے تیرہ سو سال کے فرسودہ قوانین ہی کے اعتصام وتمسک پر اصرار کیا تو پھر مملکت تو اپنی ذمہ داریاں پورا کرنے سے رہی جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے ترقی پذیر تقاضوں کے مقابلے میں اس رجعت پسندانہ جمود وتعصب کو شکست کھانا پڑے گی اور یہ اپنی شکست کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی لے ڈوبے گا۔"

اس کے ساتھ زکوٰۃ کی تقسیم میں شریعت کو یہ اصرار ہے کہ ہر بستی سے جو زکوٰۃ وصول ہو وہیں کے فقرار ومستحقین میں صرف کر دی جائے، بقول صاحب بدائع الصنائع۔

"واما زکوٰۃ المال فحیث المال فی الروایات کلہا"[1]

مگر

"قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جو محاصل کی تشخیص وتحصیل کے معاملہ میں جدید نظریات کی معتقد ہیں اور ہر کام کو منصوبہ بندی کے تحت کرنا پسند کرتی ہیں، اس چیز کو اپنا سکتی ہیں یا نہیں اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو یہ کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو علاقے زیادہ پست حال ہیں وہ برابر پست حال ہی رہیں کم از کم زکوٰۃ کی مد سے ان کی اصلاح وترقی میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیا جا سکتا، کیوں کہ پست حال علاقوں میں قدرتی طور پر زکوٰۃ کی آمدنی بہت تھوڑی ہوگی اور دوسرے علاقوں کی زکوٰۃ ان علاقوں کی امداد کے لئے مشکل ہی سے کچھ منتقل کی جا سکتی ہے۔

دوسری یہ کہ کوئی حکومت کسی منصوبہ بندی کے تحت اپنی زکوٰۃ کی پوری آمدنی کسی ایسی دوررس اور مفید اسکیم میں نہیں خرچ کر سکتی جس سے اس ملک کے پست حالوں اور غریبوں کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچے۔ حالانکہ موجودہ زمانہ منصوبہ بندی کا زمانہ ہے"[2]

لیکن یہ غلط فہمیاں اسلامی مملکت کی مالی تنظیم (FISICAL ORGANISATION)

---

[1] بدائع الصنائع جلد ثانی ص۵۰ [2] ترجمان القرآن محرم ۸۵ھ صفحہ ۲۳

سے عدم واقفیت کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں۔ ہم نے اسلامی مملکت کی آمدنی کو صرف زکوٰۃ ہی میں منحصر سمجھ لیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسلامی ریاست میں آمدنی کے (اور اسی طرح مصارف کے) چار شعبے ہوتے ہیں۔

الاول الخمس

الثانی الزکوٰۃ والعشر

الثالث الخراج وغیرہ

الرابع الضوائع یعنی اموال فاضلہ (MISCELLANEOUS HEAD)[1]

ان میں سب سے بڑی مد خراج کی ہوتی تھی" چنانچہ ابن خلدون نے مامون الرشید کے عہد کے سرکاری کاغذات سے جو خراج کی آمدنی کا نقشہ مرتب کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت نقد آمدنی اڑتالیس کروڑ آٹھ لاکھ پچپن ہزار درہم تھی اور آمدنی بشکل جنس اس کے علاوہ تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پرانے زمانے میں جب کہ اسلامی ممالک میں آئین اکبری اور قورۂ چنگیز خانی کے بجائے اسلامی فقہ پر عمل ہوتا تھا تمام ترقیاتی منصوبہ بندیاں اور دیگر رفاہِ عامہ کے کام اسی خراج کی آمدنی سے چلا کرتے تھے چنانچہ شمس الائمہ السرخسیؒ المتوفی ۴۸۳ھ ہجری نے المبسوط میں لکھا ہے

" والنوع الثالث الخراج ..... فهذا النوع مصروف الى نوائب المسلمين ومنها اعطاء المقاتلة كفايتهم وكفاية عيالهم لانهم فرغوا انفسهم للجهاد ورفع شر المشركين عن المسلمين فيعطون الكفاية من اموالهم ومن هذا النوع ايجاد الكراع والاسلحة وسد الثغور واصلاح القناطر والجسور وسد الشقوق وكرى الانهار العظام۔ ومنه ارزاق القضاة والمفتين والمحتسبين والمعلمين وكل نوع من فرغ نفسه لعمل من اعمال المسلمين على وجه الحسبة وكفايته في هذا النوع من المال "[2]

---

[1] المبسوط جزء ثالث ص ۱۷-۱۸ [2] ایضاً

مدِ خراج سے ان گوناگوں مصارف کے باوجود خلفاء و سلاطین کے خزانے خالی نہ ہوتے تھے لیکن اگر بالفرض مدِ خراج میں کچھ نہ رہے اور رفاہِ عامہ کے کاموں کی تعمیر کے لئے روپیہ کی ضرورت ہو تو اہلِ دول پر اس کام کے لئے بالجبر ٹیکس لگایا جائے گا۔ لیکن "حدِ زکوٰۃ میں سے لے کر کسی ترقیاتی اسکیم پر روپیہ نہیں لگایا جا سکتا، ہنگامی حالات (EMERGANCY) میں اگر بیت المال صدقہ سے کچھ ادھار لے کر ان مصارف میں خرچ کر دیا جائے تو یہ رقم بیت المال خراج پر قرض رہے گی"[1]

بہر حال مدِ زکوٰۃ سے اجتماعی فلاح و بہبود کی اسکیموں یا پست حال علاقوں کی ترقی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا سوال کبھی پیدا نہیں ہوا۔ دور کیوں جایئے شیر شاہ سوری جس نے اجتماعی فلاح و بہبود کے بہت سے کام کئے، اس نے صرف خزانہ عامرہ ہی سے ان کاموں کو پورا کیا کبھی زکوٰۃ کی آمدنی پر نظر نہ ڈالی۔ خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے "غریبوں کے لئے تالاب" نہیں بلکہ عامۃ الناس کے لئے نہر زبیدہ بنوائی جو فن انجنیری کا شاہکار ہے مگر اس میں زکوٰۃ کا پیسہ کسی سے لے کر نہیں لگایا۔ زکوٰۃ کی مد ایک خاص مد ہے اس کی آمدنی کے ذرائع اور خرچ کے مصارف دونوں متعین ہیں نیز اس کے شرائط و وجوب اور طریقِ ادا کی تفصیلات مقرر ہیں اُن میں تغیر و تبدل کا حق نہ فقہائے قدیم کو تھا اور نہ مفکرینِ عہدِ جدید کو۔

اور اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ وہ یہ کہ زکوٰۃ عباداتِ خالصہ میں سے ہے ہر چند کہ اس میں ایک اقتصادی جہت ECONOMIC ASPECT بھی ہے لیکن اس کا تعبدّاتی پہلو غالب ہے اور تعبدی امور میں خود عقلِ سلیم کا تقاضا ہے کہ عقل کے خوض و تعمق کو زیادہ دخل نہ ہونا چاہیئے ورنہ دھیان گیان سے نماز کا، مسہل و جلاب سے روزہ کا، قومی چندوں اور نیشنل بانڈس کی خریداری سے زکاۃ کا، اور بین الاقوامی یا بین الاسلامی کانفرنسوں کی شرکت سے حج کا بآسانی بدل ڈھونڈا جا سکتا ہے لیکن اس قسم کی تجاویز الحاد و زندقہ کے مترادف ہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا۔ کہ امورِ تعبدی کی لِم کو عقلِ ظاہر بیں کا تختۂ مشق نہ ہونے دیا جائے کیوں کہ عقل رمضان کی آخری تاریخ کے روزہ اور یکم شوال کے افطار میں فرق کی حکمت بتانے سے بالکل قاصر ہے۔

---

[1] المبسوط جزء ثالث صفحہ ۱۷ - ۱۸

لیکن ادھر کوئی ڈیڑھ سال سے تملیک فی الزکوٰۃ کا مسئلہ مبحوث فیہا بنا ہوا ہے اور اگرچہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے اس مسئلے کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے بلکہ تملیک فی الزکوٰۃ کی دلائلِ شرعیہ بھی بیان فرما دی ہیں مگر بعض حضرات اس سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ چنانچہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے ان دلائلِ شرعیہ کو محلِ نظر قرار دیا ہے اور ہر دلیل کے متعلق اعتراضات فرماتے ہیں۔

سطورِ ذیل میں ان اعتراضات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے، چند تمہیدی کلمات عرض کر دئے جائیں جن کی اثناء بحث میں ضرورت پڑے گی اور جو غالباً فیما بین متفق علیہا ہیں اور شاید حضرات معترضین کو بھی ان کے تسلیم کرنے میں تردد نہ ہوگا۔

اَوّلاً :۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک بات جتنی بدیہی اور واضح بالذات ہوتی ہے اتنا ہی اس کا ثبوت مشکل ہوا کرتا ہے مثال کے طور پر "قضیہ تردید بین النفی والاثبات" (یعنی الشیٔ اما ان یکون او لایکون) ہی کو لے لیجئے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہاں تک کہ اسے اجلی البدیہیات" کہا گیا ہے اور اسی وجہ سے حکمار سابقین نے اسے "اول الاوائل" کا نام دیا تھا۔ باایں ہمہ اس کا ثبوت ناممکن ہے اور ہر ایسی کوشش جو اس کا ثبوت فراہم کرنے کے سلسلے میں آج تک کی گئی وہ نہ صرف "کوہ کندن وکاہ برآوردن" ہی کا مصداق ٹھہری بلکہ بسا اوقات تشکیک و سفسطہ تک پہنچ گئی[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے المحصل للرازی ص ۱۳-۱۹ اور شرح المواقف موقف اول مرصد رابع الفرقۃ الثالثۃ القادحون فی البدیہیات فقط]

غرض ثبوت کی صعوبت یا فقدان اس قسم کے حقائق کی صحت کو مقدوح نہیں کر سکتے بقول شارح مواقف۔

"لان الاولیات مستغنیۃ عن ان یذب عنہا"

ثانیاً :۔ حقائق دینیہ کا انھیں الفاظ کے ساتھ جن میں انھیں فقہاء و متکلمین نے مدوّن کیا ہے، کتاب و سنت میں منصوص ہونا ضروری نہیں ہے ورنہ یہ قید تعطیل شرائع کے لئے اچھا خاصہ بہانا بن جائے گی۔ مثلاً خود اصلاحی صاحب کا یہ کلیہ۔

" یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شریعت میں کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کتاب اور سنت کے اندر اس کی کوئی اصل ہو۔ بغیر اس قسم کی کسی اصل کے کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دے دینا دین میں ایک اضافہ ہے جس کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے "

گو اپنی جگہ پر عامۂ مسلمین کا معمول بہ ہے اور کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ با ایں ہمہ کتاب اللہ کی کوئی آیت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ایسی نہ ملے گی جس کا یہ کلیہ اُردو ترجمہ ہو [لفظی نہ سہی آزاد ترجمہ ہی سہی] ہاں اُن آیات و احادیث کی تعداد قلیل نہیں ہے جن سے یہ کلیہ مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

" ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھٰذا حلال وھٰذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب۔ ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون " یا

" من احدث فی دیننا ھٰذا ما لیس منہ فھو رد " وغیرہما

ثالثاً :- ایک مسلمان کے لئے اصل اور مقصدِ حیات احکامِ شریعت کا غیر مشروط اتباع ہے۔ خدا اور رسول کا حکم اگر مصلحتِ ظاہر یا بالفرض مقتضائے عقل سے کبھی متصادم ہوتا ہو تو ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ حکم خدا اور رسول کے مقابلے میں مصالح اور مقتضیاتِ عقل کو قربان کر دیا جائے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور یہی ارشادِ خداوندی ہے

" وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً "

بلکہ شرطِ ایمان ہی رسول صلعم کی بے پناہ عقیدت ہے۔

" فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما "

یہ آپ کی حیاتِ ظاہری میں تھا اور اس کے بعد مقتضائے ایمان یہی ہے کہ فرموداتِ نبوی

کو بغیر تاویل و توجیہہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ اپنا معمول بہ بنائیں اور نصوص قطعیہ میں اپنی خواہشات و اہواء کے مطابق تاویلات رکیکہ کر کے کتر بیونت نہ کریں اس لئے کہ بغیر دلیل کے تقیید مطلق و تخصیص عام منکرین حدیث کا شعار ہے۔

رابعًا:- جو امر خصوصیت سے ملحوظ رہنا چاہیئے یہ ہے کہ ہماری ایک مخصوص آئیڈیالوجی ہے، ایک منفرد تصورِ کائنات ہے اور ایک مستقل نظامِ اقدارِ حیات ہے جو غیر اسلامی آئیڈیالوجی، نظریاتِ کائنات اور تصوراتِ اقدارِ حیات سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ ذہنی اضطراب و فکری انتشار اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اسلامی و غیر اسلامی تصورات میں خلطِ مبحث کرنا چاہتے ہیں یا اسلامی نظام میں غیر اسلامی نظاموں کا جوڑ پیوند لگانا چاہتے ہیں اور غیروں کے معیارِ خوب و ناخوب سے اپنے معاشرہ کی بلندی و پستی کی پیمائش کرنا چاہتے ہیں۔ جس چیز کو قرآن خصوصیت سے ممنوع قرار دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کی اس ظاہری عظمت و رفعت سے دھوکا کھانے لگیں۔

"لا یغرنك تقلب الذین کفروا فی البلاد ۔ متاع قلیل ثم مأواهم جهنم وبئس المهاد"

(آل عمران ۹۶ - ۹۷)

"ولا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحیوة الدنیا لنفتنهم فیه ورزق ربك خیر وابقی" (طٰ ۱۳)

وہ اس بات کی بھی ممانعت کرتا ہے کہ خوب و ناخوب کے تعین کے باب میں خدا و رسول کے بخشے ہوئے معیار کے بجائے اپنی خواہشات و اہوا کو معیار بنائیں۔

"عسیٰ ان تکرهوا شیئا وهو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا وهو شر لکم والله یعلم وانتم لا تعلمون"

خامسًا:- ایمان باللہ اور ایمان بالرسالۃ، ہدایتِ خداوندی کے باب میں خوش اعتمادی کے متقضی ہیں۔ ممکن ہے اسلام کی اجتماعی تنظیم کا کوئی جزدی پہلو اپنے نظیری غیر اسلامی پہلو کے مقابلے میں پھیکا نظر آئے اور اُس میں وہ رونقِ ہنگامہ مفقود ہو جو جاہلی نظاموں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن خلوصِ

ایمان کا تقاضا ہے کہ ہر حال میں مرد مومن اسلامی نظام کی برتری اور اس کی افادیت و معقولیت کا کامل یقین رکھے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نظام کا بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے جس سے اچھا نظام کوئی دوسرا نہیں بنا سکتا۔

"ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون"

اسی طرح جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات و ارشادات کو بھی نہ صرف واجب الاتباع جانیں بلکہ اُن کے خیر محض ہونے کا بھی یقین رکھیں اس لئے اُن کی تعلیم عین حکمت ہے۔

"لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین"

اور یہی یقین محکم ہماری برتری اور تفوق کا ضامن ہے بفحوائے حکم قرآنی "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین"

ان تمہیدی مقدمات کے بعد آیئے اُن ایرادات و اعتراضات کا جائزہ لیں جو اصلاحی صاحب نے تملیک فی الزکوٰۃ کے دلائل پر وارد کئے ہیں سب سے پہلے تو انھوں نے اپنے اس کلیہ کے بعد جس کا مقدمہ ثانیہ میں حوالہ دیا گیا ہے، تمہید مقصد کے لئے عنایہ کا ایک اقتباس نقل کر کے صاحب عنایہ کے متعلق یہ فرمایا ہے

"ان کا اپنا اعتراف یہ ہے کہ تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کی کوئی نقلی دلیل موجود نہیں ہے"[1]

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

صاحب عنایہ تو یہ فرماتے ہیں کہ

"ولقائل ان یقول قولکم "التملیک رکن" دعوی مجردۃ اذ لیس فی الادلۃ النقلیۃ المنقولۃ فی ھذا الباب مایدل علی ذالک خلا قولہ تعالی "انما الصدقات للفقراء" وانتم جعلتم اللام للعاقبۃ دون التملیک۔ والجواب ان معنی قولھم "للعاقبۃ"

---

[1] ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ صفحہ ۴۰۲

ان المقبوض یصیر ملکا لھم فی العاقبۃ "

[ایک معترض یہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ تمہارا یہ قول کہ " تملیک رکن زکوٰۃ ہے محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے کیوں کہ اس سلسلے میں جو دلیلیں نقل کی جاتی ہیں اُن میں سے سوائے آیۂ کریمہ "انما الصدقات للفقراء " کے کوئی اس بات پر دلالت نہیں کرتی اور حال یہ ہے کہ تم اس لام کو عاقبت کے معنے میں لیتے ہو نہ کہ تملیک کے ۔

جواب اس کا یہ ہے کہ احناف کا یہ کہنا کہ "لام عاقبت کے واسطے ہے" اس کے معنی یہ ہیں کہ مال مقبوض انجام کار فقراء کی ملکیت بن جاتا ہے]

ظاہر ہے صاحب عنایہ نے جیسا کہ منطقیت پسند متاخرین کی عادت ہے بطور دفع دخل مقدر کے ایک فرضی معترض کا اعتراض تراش کر اس کا جواب دیا ہے صاحبِ عنایہ کی اصل عبارت قارئین کرام کے سامنے ہے اور وہ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ

(ا) یہ صاحب عنایہ کا اپنا اعتراف نہیں ہے کہ " تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کی کوئی نقلی دلیل موجود نہیں ہے " بلکہ ایک فرضی معترض کا اعتراض ہے ورنہ اگر ان کو اس بات کا اعتراف ہوتا یا خود اُن کا اپنا یہ اعتراض ہوتا تو وہ آخر میں ہرگز جواب نہ دیتے بلکہ زیادہ سے زیادہ "فافہم" یا " فتامل " کہہ کر خاموش ہو جاتے جیسا کہ شراح و محشیین کا دستور ہے کہ جب وہ ماتن سے اختلاف کرتے ہیں تو فافہم یا فتامل کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ یہاں ماتن سے چوک ہوئی ہے یا اس کا استدلال غلط ہے ۔ جواب دینا تو اپنے ہی اعتراض کی خود اپنے ہاتھوں دھجیاں بکھیرنا ہے

(ب) یہ کسی واقعی معترض کا اعتراض بھی نہیں ہے بلکہ دفع دخل مقدر کے طور پر ایک فرضی اعتراض فرض کر لیا ہے ۔ جیسا کہ " ولقائل ان یقول " میں قائل کی تنکیر سے اور فعل مضارع سے ظاہر ہے

(ج) وہ فرضی معترض بھی یہ نہیں کہتا کہ تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کی کوئی نقلی دلیل موجود نہیں ہے ۔ اس کا تو کہنا یہ ہے کہ " جو ادلہ نقلیہ اس باب میں نقل کی جاتی ہیں وہ سوائے آیہ کریمہ "انما الصدقات للفقراء " کے مقصود پر دلالت نہیں کرتیں " اسے خود اعتراف ہے کہ " تملیک فقیر کے سلسلے میں

دلائل تو دئے جاتے ہیں مگر وہ سوائے آیہ "انما الصدقات للفقراء" کے غلط ہیں کیوں کہ وہ (اس فرضی معترض کے زعم میں) مقصود پر دلالت سے قاصر ہیں"

(د) اور آیۂ کریمہ "انما الصدقات للفقراء" کے متعلق اس فرضی معترض کو بھی احساس ہے کہ وہ تملیکِ متصدق علیہ پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ جملہ منفیہ کے استثنار سے مستفاد ہوتا ہے مگر اسے شکوہ ہے کہ صحیح استدلال کے بجائے غلط استدلال کیا جاتا ہے کہ لام للفقراء کو لام تملیک کے بجائے لام عاقبت گردانا جارہا ہے۔

اس لئے اس فرضی معترض کے نزدیک صورتِ حال یہ ہے:۔ دیگر ادلہ دلالت علی المقصود سے قاصر ہیں اور آیت "انما الصدقات للفقراء" سے غلط استدلال کیا جاتا ہے اور صحیح استدلال (ممکن ہے شوافع کے اعتراض سے بچنے کے لئے) پیش نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا دعویٰ تملیک دعوی بلا دلیل ہی رہا۔

(ہ) صاحب عنایہ اس معترض کا جواب دیتے ہیں۔

یہ جواب فطری ہے یا مبنی بر تکلف (جیسا کہ اصلاحی صاحب کہتے ہیں) اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کے باب میں دلائلِ نقلیہ کے فقدان کے معترف نہیں ہیں۔ یہ تو ہے صاحب عنایہ کا منشائے عبارت جو اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی کھینچا تانی کی ضرورت نہیں مگر اصلاحی صاحب فرماتے ہیں

"اُن کا (صاحب عنایہ کا) اپنا اعتراف یہ ہے کہ تملیک کے رکن زکوٰۃ ہونے کی کوئی نقلی دلیل موجود نہیں ہے"

میں نے اس بات کو اس وجہ سے طول دیا کہ قارئین کرام اصلاحی صاحب کے انداز استدلال کا اندازہ لگالیں کہ وہ کس طرح ذہن میں پہلے سے ایک فیصلہ قائم کرکے اپنے حسب منشار نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہرکیف اس تمہیدِ مقصد کے بعد اصلاحی صاحب نے مسئلہ تملیک فقیر کی ادلہ شرعیہ پر اعتراضات کئے ہیں ان اعتراضات کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے پہلے مسئلہ تملیک فی الزکوٰۃ کے دلائل بیان کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وآتوا الزکوۃ" اور تملیک "ایتاء" کے مفہوم کا جزء ہے جیساکہ کاشانی نے بدائع الصنائع میں لکھا ہے:

"قد امر اللہ تعالیٰ الملاک بایتاء الزکوۃ لقولہ عزوجل "واتوا الزکوۃ" والایتاء ھو التملیک"[1]

۲۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "انما الصدقات للفقراء" الآیہ اور "صدقہ" تملیک ہے جیساکہ کاشانی نے بدائع الصنائع میں لکھا ہے

"ولذا سمی اللہ تعالیٰ الزکوۃ صدقۃ بقولہ "انما الصدقات للفقراء" والتصدق تملیک"[2]

اسی طرح ابن الہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے

"التملیک وھو الرکن فان اللہ تعالےٰ سماھا صدقۃ وحقیقۃ الصدقۃ تملیک المال من الفقیر"[3]

اُن سے پہلے شمس الائمہ السرخسی نے شرح سیر الکبیر میں فرمایا تھا۔

"والصدقۃ تملیک من اھل الحاجۃ"[4]

اور اس کی مزید وضاحت انھوں نے بدیں طور کی تھی۔

"انہ اذا لم یکن فیہ تملیک العین لم یکن صدقۃ"[5]

اسی طرح امام جصاص الرازی (المتوفی ۳۷۰ھ) نے فرمایا تھا

"فان الصدقۃ تقتضی تملیکا"[6]

بلکہ امام سرخسی کی تصریحات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی اصول تھا اور اسی وجہ سے وہ ناقابل ذخیرہ کردنی اشیاء میں عشر کے قائل نہ تھے۔

---

[1] بدائع الصنائع جلد ثانی ص۳۹ [2] ایضاً [3] فتح القدیر کشوری ص۳۵۸ جلد اول [4] شرح سیر الکبیر جلد چہارم ص۲۴۴ [5] ایضاً ص۲۶۳ [6] احکام القرآن للجصاص الرازی جلد ثالث ص۱۵۴۔

"ولابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ حرفان ...... والثانی ان العاشر یأخذ من عین ما یمر بہ علیہ ولیس بحضرتہ فقراء لیصرفہ الیھم ولا یمکنہ ان یدخرہ الی ان یأتیہ الفقراء لان ذالک یفسد فقلنا لا یأخذ منہ شیئاً ولکن یأمرہ بالاداء بنفسہ"[1]

۳۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ" اور "وفی اموالھم حق للسائل والمحروم"، اور لام براہ راست (جیسا کہ شوافع کا خیال ہے کہ وہ اسے لام تملیک مانتے ہیں) یا بالواسطہ (جیسا کہ مالکیہ اور احناف کا خیال ہے کہ وہ اسے لام صیرورت اور لام عاقبت مانتے ہیں، یعنی انجام کار مقبوض ملک فقیر بن جاتا ہے) تملیک کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ کاشانی نے بدائع الصنائع میں لکھا ہے:-

"واما النص فقولہ تعالیٰ "انما الصدقات للفقراء" وقول عز وجل "وفی اموالھم حق للسائل والمحروم" والاضافۃ بحرف اللام تقتضی الاختصاص بجھۃ الملک اذا کان المضاف الیہ من اھل الملک"

۴۔ حدیث مشہور ہے کہ جب معاذ بن جبلؓ کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو ایک طویل ہدایت کے ضمن میں زکوٰۃ کے متعلق فرمایا:-

"ان اللہ افترض علیھم الزکوٰۃ توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم"[2]

اور "رد علی الفقراء" بغیر تملیک کے متصور نہیں ہو سکتا۔ اس حدیث کو عموماً ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہ کرنے کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے لیکن "تملیک فقیر" بھی اس سے ثابت ہوتی ہے جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ" الآیہ یہاں لام علی الاقل "اختصاص انتفاع" کے واسطے ہے (جیسا کہ اصلاحی صاحب نے فیصلہ کیا ہے اور ہم بھی اتماماً للحجۃ مانے لیتے ہیں) اور "انما" کلمہ حصر وقصر ہے۔ ان دونوں کا مجموعی اثر "تملیکِ فقیر" کے سوا اور کچھ معنی پیدا نہیں کر سکتا کیوں کہ انسانی ملکیت کی حقیقت محض اتنی ہی ہے کہ اسے دوسروں کے مقابلے میں اپنی ملک سے انتفاع کا حق ہو۔

اسی استدلال کی طرف علامہ زمخشری نے کشاف میں اشارہ کیا ہے۔

"قصر لجنس الصدقات علی الاصناف المعدودۃ وانھا مختصۃ بھا لا تتجاوزھا الی غیرھا کانہ قیل "انما ھی لھم لا لغیرھم" ونحو قولک انما الخلافۃ لقریش ترید لا تتعداھم ولا تکون لغیرھم"

بہرکیف اب ان دلائل کی توضیح سنیئے۔

---

[1] المبسوط للسرخسی الجزء الثانی ص۲۰۵ [2] صحیح مسلم باب الدعاء الی الشہادتین وشرائع الاسلام

(باقی آئندہ)